

۱۲  
درس

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

# عائی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی — درس ۱۲

# عائی زندگی کے بنیادی اصول

## سُورۃ التحریم کی روشنی میں

مقدمہ و محتوى

ڈاکٹر سید احمد



مکتبہ حدام القرآن لاہور

36 کے ماذل ٹاؤن لاہور، فون: 5869501-3

اس کتابچے کی اشاعت و طباعت کی ہر شخص کو حلی اجازت ہے

نام کتابچہ ————— عائی زندگی کے بنیادی اصول (درس 12)  
طبع اول (ستمبر 1989ء)  
2200 —————  
طبع دوم (مارس 2005ء)  
2200 —————  
طبع سوم (جون 2008ء)  
2200 —————  
ناشر ————— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور  
مقام اشاعت ————— 36۔ کے ناڈل ٹاؤن لاہور  
فون: 3-5869501  
طبع ————— شرکت پرنگ پرنس لاہور  
روپے 20 ————— قیمت

# عائلي زندگي کے بنیادی اصول

## سورۃ الْخَرْمَم کی روشنی میں

لَحْمَدُه وَهُنْدَیٰ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ ..... اما بعد:

أَغُوْذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَنِ الرَّجِيمِ ..... بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 (لَتَبَرُّهَا النَّبِيُّ لَمْ تُخَوِّمْ مَا أَخْلَى اللَّهُ لَكَ) ؛ تَبَقِّي مَرْضَاتٍ أَزْوَاجَكَ  
 وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ① لَذِكْرِ رَحْمَةِ اللَّهِ لَكُمْ تَحْلَةٌ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَانَكُمْ  
 وَهُوَ الْعَلِيمُ الْعَزِيزُ ②) ..... صدق اللہ العظیم

”اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کیوں حرام کرتے ہیں وہ جیز جو اللہ نے آپ کے لیے  
 حلال فھرایی ہے اپنی بیویوں کی خوشودی حاصل کرنے کے لیے اور اللہ بخشش والا  
 حرم فرمائے والا ہے۔ اللہ نے تمہاری قسموں کو کھولنے کے لیے طریقہ میں کر دیا  
 ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارا پشت پناہ اور ہدایا ہے اور وہ سب کچھ جانتے والا اور کمال  
 حکمت والا ہے۔“

سورۃ الْخَرْمَم اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ ہے — اور مطالعہ قرآن حکیم  
 کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے اس کا بھیت بھوئی یہ  
 پارہواں درس ہے اور تیرے حصے یعنی ”مباحث عمل صالح“ کا تیرا درس ہے۔ اس  
 منتخب نصاب کے جن دروس کا ہم مطالعہ کر سکتے ہیں ان کے درمیان جو محتوى رہا و تعلق  
 اور مختلط ترتیب ہے اس کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیا!

اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسماق پر مشتمل ہے، جس میں انسان کی  
 کامیابی اور فوز و فلاح کے چاروں لوازم یعنی ایمان، عمل صالح، توافق اور توافقی  
 بالصر کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں چند ایسے مقامات شامل ہیں جو خاص طور پر ایمان

کے مباحث سے متعلق ہیں۔ تیرے حصے میں اعمال صالح کی بحث ہے جو چاری نسبت  
ظاہر ہات ہے کہ انسانی اعمال میں سب سے پہلے انفرادی سیرت و کردار کا معاملہ  
زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ اس حصے کے پہلے دو ساق میں انفرادی سیرت و کرداری عیوب  
سے متعلق پنداہم پہلو سانے آئے ہیں۔ اولین درس جو سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ  
آیات اور سورۃ الماعرج کی درمیانی سڑہ ہم مضمون آیات پر مشتمل ہے میں قرآن  
نے تغیر سیرت کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں اور تغیر خودی کا جو پروگرام دیا ہے  
اس کا بیان ہے، اور سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل دوسرے سبق میں یہ  
بات ہمارے سامنے آئی کہ ایک مکمل طور پر تغیر شدہ بندہ مومن کی شخصیت کے کیا  
خدو خال ہونے چاہئیں! یعنی قرآن مجید کا انسان مطلوب کیا ہے، جسے علامہ اقبال  
مردِ مومن سے تغیر کرتے ہیں۔

اب ہم انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اجتماعیت کی پہلی منزل  
خاندان اور عائی نظام ہے۔ اس سے آگے معاشرہ اور پھر اس سے آگے ریاست ہے۔  
یہ سارے اس اجتماعیت کے مارچ ہیں جس کا نتھی آغاز خاندان ہے۔ اور آپ کو معلوم  
ہے کہ خاندان کی بنیاد رفتہ ازدواج سے پڑتی ہے، یعنی ایک مرد اور ایک عورت کے  
درمیان شوہر اور بیوی کا تعلق ایک خاندان کا سبک بنیاد ہوتا ہے۔

چونکہ اجتماعیت کا اولین قدم یہی ہے، لہذا قرآن مجید میں عائی نظام سے متعلق  
مباحث نہایت شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ آئے ہیں اور شوہر و بیوی کے رشتہ کے  
متعلق معاملات اور نکاح و طلاق کے احکام و مسائل کے بارے میں تفصیل ہدایات بیان  
ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں کمی رکوع اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ پھر سورۃ النساء سورۃ  
المائدۃ، سورۃ الاحزاب، سورۃ الحجۃ و سورۃ الطلاق اور سورۃ الحجریم میں اس موضوع پر  
مختص گوئی ہے۔ فارسی کے اس مشہور شعر کے مصادف کہ۔

خوب اوقل چوں نہد مغار بح  
ٹا ٹیا می روو دیوار بح

چونکہ خاندان انسانی معاشرے اور انسانی تہذیب و تمدن کا بنیادی پتھر ہے اور اسی پر ریاستِ ملٹن اور اجتماعیت کے تمام تصورات کی تعمیر ہوتی ہے، لہذا اگر خاندان کے ادارے کی تعمیر میں کوئی بھی یا نیز ہر وہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ ہمروہ بھی آخر سک جائے گی۔ جزاً اور بنیاد میں ضعف رہ جائے تو یہ ضعف معاشرے کی تمام طموں پر غلبہ کرے گا۔ لہذا قرآن مجید خاندان کے اس ادارے کو نہایت مسلکم کرنا چاہتا ہے اور اسے نہایت سمجھ بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں نہ کوئی عدم توازن رہے نہ ہی کوئی اونٹ نہ ہوئے قلم و تعدی ہو اور نہ یہ ضعف واشکلال کا ہٹکار ہو۔

قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے کے آخر میں اس موضوع پر سورۃ المطلاق اور سورۃ الحیریم کی صورت میں دونہایت حسین و جمیل سورتوں کا جوڑا اہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی سورتوں یعنی سورۃ البقرۃ، سورۃ الشاہد وغیرہ جن میں عالی زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے ان پر اس محمد و دوست میں گھنکوںہیں ہو سکتی۔ البتہ سورۃ الحیریم (جس کا مطالعہ آج کی اس نشست سے شروع ہو رہا ہے) کی ہر آیت کا ہم قدرے تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ لیکن اس سے قبل میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ان شاہزاد آپ کو فہم قرآن کے لیے رہنمائی ملے گی اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں جو پاہی رہبا اور فہم ہے اس کے ہارے میں آپ کو ایک بصیرت باطنی حاصل ہو گی۔ قرآن مجید میں اکثر و پیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اب جوڑے ہونے کی نسبت کا تقاضا ہے کہ موضوعِ زیر بحث کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مثاہبہت بھی ہو اور دوسرے یہ کہ ان میں ایک حصیم بھی ہو۔ یعنی تصویر کا ایک رخ یا ایک پہلو اگر ایک سورت میں آیا ہے تو اس کا دوسرا رخ اور دوسرا پہلو دوسری سورت میں آئے۔ جیسے قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ”موزٰتْنَ“ ہیں۔ ان دونوں کا مضمون ایک بھی ہے۔ تھوڑا کا ایک پہلو سورۃ المطلاق میں آ گیا ہے، یعنی ان والوں اور بلاوں کا سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا کرنا جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور تھوڑا کا دوسرا رخ سورۃ الناس میں آ گیا ہے، یعنی ان وسیوں اور بہکاؤں سے پناہ کے لیے اللہ

سے دعا کرنا جو شیطان اور اس کی صلی و محنوی اولاد انسان کے دل و دماغ اور باطن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح عالمی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں؛ جنہیں تصویر کے دو رخ یا معاملات کے دو اجزاء کہہ لیجئے جو سورۃ الطلاق اور سورۃ الحرم میں سامنے آتے ہیں۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان سورتوں کا بنیادی اور مرکزی مضمون کیا ہے؟ خاندان کے جذبات کا خاطر رکھنا اور ایک دوسرے کے احساسات کا پاس کرنا ایک بنیادی قدر ہے۔ جس مکر میں شوہر اور بیوی کے ماہین یہ کیفیت نہیں ہے تو یوں سمجھئے کہ زبردستی اور مارے باندھے کا ایک رشتہ ہے جو قائم ہے۔ اس رشتہ میں چاشنی اور باہم محبت و آفت درکار ہے۔ اگر وہ موجود نہیں ہے تو ایسا کہ اس دنیا میں جنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ الغرض عالمی زندگی میں دور ویے ہیں جن میں انسان اختتالک چلا جاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عدم موافقت ہے دونوں کے مرا جوں میں کوئی ایسا بعد ہے کہ باہم موافقت نہیں ہو پائی تو اس کی اختتالک طلاق ہے۔ یہ مضمون سورۃ الطلاق میں آیا ہے۔ سورۃ الحرم اور سورۃ الطلاق میں مشابہت دیکھئے کہ دونوں کے آغاز میں براو راست نبی اکرم ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے۔ البتہ سورۃ الطلاق کے شروع میں طلاق کا ذکر ہے، مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں طلاق کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لہذا شروع میں تو خطاب آنحضرت ﷺ سے ہے لیکن فوراً بعد ہی (إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ) سے آخر آیت تک جمع کا صیغہ آیا ہے۔ یعنی دراصل یہ بات رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے آپؐ کی وساطت سے مسلمانوں سے کمی جاری ہے کہ اسے مسلمانو! اگر تمہارے بیہاں کوئی اس حرم کی صورت حال پیش آجائے کہ طلاق ناگزیر ہو جائے تو یہ روشن اختیار کردہ یہ اس کے قواعد و ضوابط اور شرعاً کا داد و داب ہیں۔

یہ بات تمدنی اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بعض معاشروں اور بعض مذاہب نے طلاق کو عالمی زندگی سے خارج کر دیا ہے جبکہ اسلام کا نظام بڑا متوازن اور معتدل ہے۔ اسلام کے عالمی نظام میں ایک طرف تو طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض چیز کہا گیا ہے اور ساتھ ہی بیوی کی ناپسندیدہ خادتوں سے

صرف نظر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف میں، جو حضرت ابو ہریرہ رض سے مردی ہے، جبی اکرم صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام نے بطور انتہا فرمایا:

(لَا يُقْرَأُكُلُّ مُؤْمِنٍ مُّؤْمِنَةً إِنْ كَجْرَةً مِنْهَا خَلَقَهُ اللَّهُ صَرِيفًا مِنْهَا آخِرًا) <sup>(۱)</sup>

یعنی کسی مؤمن کو اپنی بیوی سے اس کی کسی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری عادت اسے اچھی بھی تو لگتی ہے۔

اس ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام کی روشنی میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جانشین ایک دوسرے کی خوبیوں اور بھلا سیوں پر نگاہ رکھیں تاکہ حتی الامکان کوشش ہو سکے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود کسی وجہ سے موافقت پیدا نہیں ہو رہی تو پھر اسلام ان دونوں کو زبردستی پا نہ کر کرنا نہیں چاہتا۔ اس زبردستی کے بندھن سے معاشرے میں خیر پیدا نہیں ہوتا، شر پیدا ہوتا ہے، لہذا طلاق کا راستہ کھولو دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جو قواعد و ضوابط اور آداب و شرائط ہیں انہیں بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری یہ فحصی ہے کہ ان آداب و شرائط کو ہمارے معاشرے میں عام طور پر خود نہیں رکھا جاتا اور کوئی شوہر غصہ میں آ کر ایک ہی وقت میں آخری قدم اٹھا بیٹھتا ہے اور ایک وغیرہ تین طلاقیں دے دھاتا ہے اور بعد میں پچھتا تاہے۔

دوسری طرف غالباً زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کی دل جوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کا محالہ حد اعتدال سے بڑھ جائے اور شوہر اپنی بیوی کی رضا جوئی میں اس حد تک چلا جائے کہ شریعت کے احکام نوٹے لگیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش اور راضی کرنے کے لیے یا اس کی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لیے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال نہ بھرا لے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا تو سرے سے کوئی امکان نہیں اکرم صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام کے لیے نہیں تھا، معاذ اللہ عما نهى۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام نے اپنی بعض ازواج ایتھر رات صلی اللہ علیہ وس علیہ السلام

کی دل جوئی خود رکھی۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ پسندیدہ اور مطلوب ہے، آپ ﷺ اس کی ترغیب دی ہے رسالت آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ((عَمَّا مُكِنِّمٌ عَمَّا سُكِّيْنٌ لَا يَهْلِكُهُ وَاتَّا  
عَمَّا سُكِّيْنٌ لَا يَهْلِكُهُ))<sup>(۱)</sup> تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنے گمراہوں کے حق میں  
بہترین طرزِ عمل اختیار کرنے والے ہیں اور جان لوکر میں تم میں سے اپنے گمراہوں  
کے لیے بہترین روشن اختیار کرنے والا ہوں۔ اگرچہ یہ ایک پسندیدہ طرزِ عمل ہے مگر  
ایک خاص واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کی گئی۔ اس لیے کہ  
حضرت یعقوب ﷺ کے محاں میں یہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر  
اوٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن یہود نے یہ سمجھ لیا کہ اوٹ کا گوشت حرام  
ہے۔ گوپا ایک نبی کے ذاتی ذوق کے محاں کو شریعت کا جزو بنا لیا گیا اور اوٹ کے  
گوشت کی حرمت نبی اسرائیل کی شریعت میں مستحق ہو گئی۔

میں نے جس خاص واقعہ کا حوالہ دیا ہے وہ احادیث میں تفصیل سے بیان ہوا  
ہے۔ سورۃ الحیرم میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ احادیث بھی سے معلوم ہوتا  
ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ حصر کی نماز کے بعد تھوڑی تھوڑی دری کے لیے  
سب ازواج مطہرات ﷺ کے بیہاں تعریف لے جاتے۔ ازواج مطہرات کو آپ ﷺ کے  
سامنے جو محبت اور جو تعلق خاطر تھا اس کے پیش نظر ہر زوجہ حضرت ملکی سیکی تھنا اور کوشش ہوتی  
تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی توجہات کا مرکز بنے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے رسول  
اللہ ﷺ کی بامراکت محبت میں رہنے کا موقع فصیب ہو۔ لیکن آپ ﷺ اس محاں میں  
کامل عدل سے کام لیتے تھے اور ہر زوجہ حضرت ﷺ کے بیہاں مساوی وقت دیتے تھے۔ ایک  
روز رسول اللہ ﷺ کو حضرت نبیت بنت جحش ﷺ کے بیہاں معمول سے زیادہ دری گئی۔  
ہوا یہ کہ ان کے بیہاں کمیں سے ہدایا شہد آیا ہوا تھا اور حضور ﷺ کو چونکہ شہد بہت  
مرغوب تھا اس لیے آمِ المؤمنین حضرت نبیت ﷺ نے آپ ﷺ کو شہد پیش کیا جس کے  
نوش فرمانے کے باعث آپ ﷺ ان کے بیہاں زیادہ دری تک پھرے۔ پھر کمی روز تک بھی

(۱) سنن الترمذی، کتاب الغنایب عن رسول اللہ ﷺ، باب فضل ازواج النبی۔

معمول ہوا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حصہ بیوی نے مل کر تدبیر کی کہ آپ حضرت نسب پیغمبر کے یہاں شہد پینا چوڑ دیں تاکہ آپ ان کے یہاں معمول سے زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ وہ شہد مخالفیر کے پھولوں کا تھا جس میں کچھ بساند اور پنک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ شہد کے استعمال کے بعد جب ان کے مجرے میں تشریف لے جاتے تو وہ حضور ﷺ سے کہتیں کہ آپ کے منہ سے مخالفیر کی بساند آتی ہے۔ ان دونوں نے چند دیگر ازواج مطہرات ٹھوکیں کر لیا۔ آپ چونکہ نہایت نفاست پسند تھے اور جب آپ کی متعدد ازواج مطہرات نے یہ بات کی تو آپ نے عہد کر لیا اور قسم کھانی کر آئندہ آپ یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔

ہمارے دین میں نبی اکرم ﷺ کو یہ مقام حاصل ہے کہ اگر آپ سے کوئی معمولی بات بھی ظہور میں آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اب آپ نے چونکہ اپنی ازواج مطہرات ٹھوکی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک شے اپنے اور حرام کی تھی اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ امت اس شے کو ہمیشہ کے لیے حرام یا کم از کم حد درجہ کر دے سکتے گئی یا امت کے لوگ یہ خیال کرنے لگتے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز اپنے اور حرام کر لینے کی دین میں اجازت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ مبارکہ نازل فرم کر آنحضرت ﷺ کو اس کام پر نوک دیا۔

اس نوکنے سے متعلق یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کے مطلق اور قطعی اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی بھی اگر کسی شے کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، خواہ وہ اشارہ وحی جلی کی صورت میں ہوا ہو یا وحی ختنی کے طور پر کیا گیا ہو۔

اس سورہ مبارکہ پر تدبیر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ایک ذرا بی بات پر رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف نوک دیا گیا اور اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اس کا ایک سورہ میں ذکر کر کے اس کو ابد الاباد نکل کے لیے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا تو اس

سے قطعی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جن اعمال، افعال، احکام اور ہدایات پر قرآن مجید میں کوئی گرفت یا اصلاح موجود نہیں ہے وہ سراسر قرآن ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشاہد و مرضی کے مطابق ہیں اور ان کا انتباہ ہم پر لازم ہے۔ اس بات سے سخت کی جیت و فرضیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان تمهیدی باتوں کے بعد اب ہم اس سورہ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

فرمایا: (يَأَيُّهَا النَّبِيُّ لَمْ تُحَرِّمْ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ) "ۚ" اے نبی ﷺ! آپ اس چیز کو کیوں حرام خبراتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے؟ "انداز استفهامیہ ہے لیکن مقصود آنحضرت ﷺ کو نہ کنا اور منتبہ کرنا ہے۔ (تَبَغْيُ مَرْضَاتِ أَذْوَاجِكَ) "کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟" آیت کے اس حصہ سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا یہ فضل اپنی ذاتی پسند یا تاپسند کی ہے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی وجہ سے تھا، جنہوں نے یہ صرف اس لیے چاہا تھا کہ آپؐ تبدیلی کی خاطر حضرت نبیؐ کے ہاں زیادہ دیر قیام نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب کو بیہاں بیان فرمایا کہ ازاد و ایصال مطہرات ﷺ کو منتبہ فرمادیا کہ وہ نبی کی ازواج ہونے کی نازک ذمہ داریوں کا لحاظ رکھیں۔ آگے فرمایا: (وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ) ① "اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے"۔ آیت کے اس حصہ میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام قرار دینے کا جو کام کیا ہے وہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپؐ کے منصب کی اہم ترین ذمہ داریوں کے اختبار سے مناسب نہ تھا، لہذا اللہ نے صرف توک کر اصلاح کی طرف متوجہ کرنے پر اتفاق فرمایا۔

اس مقام پر خبر کرذر اس بات پر غور فرمائیجیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو اپنی ازواج کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے لیے حرام قرار دینے پر اس شد و مذ کے ساتھ توک دیا گیا ہے تو ان لوگوں کا آخرت میں کتنا خست اور شدید موآخذہ ہو گا جو اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے حرام کو حلال کر لیتے ہیں اور پھر اس کا مسلسل اور مستقل ارثکاب کرتے رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا: «قَدْ فَوَضَ اللَّهُ لَكُمْ تِحْلَةً أَيْمَانِكُمْ» "اللہ اسی قسموں کو کھولنے کا ایک راستہ تھا رے لیے مقرر کر چکا ہے۔ اس میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ کی طرف اشارہ ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی قسم کھانی ہے اور اب اس کو کھولنا ہے تو اس کے لیے کفارہ مقرر ہے اور وہ یہ کہ دس ساکین کو کھانا کھلانے۔ وہ کھانا ایسا ہو جو انسان اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے۔— یاد ساکین کو لباس مہیا کرے۔— یا کسی ایک غلام یا لوگوی کو آزاد کرائے۔— اور اگر کسی کو ان میں سے کسی کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کا بدل یہ مقرر کیا گیا کہ ایسا شخص تین دن کے روزے رکھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کو کھولنے اور عہد کی پابندی سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ طریقہ میمن فرماتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو کفارہ ادا کر کے قسم کھول دو۔ آگے فرمایا: «وَاللَّهُ مَوْلَكُمْ» "اور (یہ بات جان بھی کر) آپ کا اور سب مسلمانوں کا مددگار (حاصل اور پشت پناہ) صرف اللہ ہی ہے۔۔۔ لہذا اسی کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہیے۔ «وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ» ⑦ "اور وہی ہے سب کچھ جاننے والا" کمال حکمت والا۔۔۔ یعنی وہ جو بھی حکم دیتا ہے اپنے علم کا مل کی بنیاد پر دیتا ہے اور اس کی حکمت بالذات حکم میں شامل ہوتی ہے۔

سورۃ الحیرم کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے خاندانی و عائلوں زندگی کے پارے میں ایک بڑی بنیادی بات آگئی کہ یہ یوں کی رضا جوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا، ان کے ساتھ رزی، محبت، مودت، الفت اور ان کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا، یہ تمام چیزیں اصلاً مطلوب اور پسندیدہ ہیں؛ لیکن ایک خاص حد تک۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ جذبہ حد احتدال سے تجاوز کر جائے اور شریعت کے احکام تو شے شروع ہو جائیں۔ لہذا ایک بندہ مؤمن کو ہمیشہ اور ہر وقت احتدال کی روشن اختیار کرنی چاہیے اور اس معاملہ میں ہوشیار اور چوکنار ہونا چاہیے۔ آیات ۲۳ تا ۵۵ میں فرمایا:

«وَإِذَا سَرَّ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَرْوَاجِهِ حَدِيدًا ، فَلَمَّا تَبَأَثْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَغْرَضَ عَنْ بَعْضِهِ ، فَلَمَّا نَبَأَهَا بِهِ قَاتَ مِنَ الْبَأْكَ

هُلَّا فَقَالَ نَبِيُّ الْعِلِّيُّ الْخَيْرُ<sup>⑥</sup> إِنْ تَوَهَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَدَقَ قُلُوبُكُمْ<sup>۱</sup>  
 وَإِنْ تَظْهِرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِيرُهُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ<sup>۲</sup>  
 وَالْمُتَّقِّيَّةِ بَعْدَ ذَلِكَ طَهِيرٌ<sup>۳</sup> عَسَى رَبُّهُ إِنْ مَلَقَكُنْ أَنْ يُعِذِّلَهُ أَزْوَاجًا  
 خَيْرًا مُنْكَرَ مُسْلِمَتِ مُؤْمِنَتِ لِفَتْحِي ثَبَاتِ طِبَابَتِ سِيَاحَتِ تِبَاتِ<sup>۴</sup>  
 وَاهْكَارًا<sup>۵</sup>)<sup>۶</sup>

”اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کھینچی، پھر جب اس بیوی نے وہ راز (کسی اور پر) ظاہر کر دیا، اور اللہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس (افشاۓ راز) کی اطلاع دے دی تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے (افشاۓ راز کی) یہ بات تہائی تو اس نے پوچھا: آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ”مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا اور خوب باخبر ہے۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو (بھی تمہارے لیے زیبا ہے) تمہارے دل تو (خدا کی طرف) مائل ہی چیز اور اگر تم نبی کے خلاف ایکا کروگی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکوکار مسلمان اور مرید ہر آں فرشتے ہیں اس کے دو گار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے تو اس کا پروردگار تمہارے بد لئے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو عطا کر دے اطاعت شعارِ مؤمنہ فرمائیں راز توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار ریاضت کرنے والیاں، شوہر آشنا اور کنوواریاں۔“

ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی عائی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ کی تفصیلات میں جانے کی چند اس ضرورت نہیں، کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم و مدعای کو خود واضح کر رہی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کوئی راز کی بات اپنی ازواج مطہرات ﷺ میں سے کسی ایک سے کھینچی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرمادی کہ یہ بات کسی اور کوئے تہائی جائے۔ ان زوجہ محترمہ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کسی دوسرا زوجہ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشاۓ راز کی خبر دے دی۔ اس پر حضور ﷺ نے نہایت ملائم شفقت اور نرمنی ہے اُن زوجہ محترمہ کو اشارہ جتنا جلا دیا کہ یہ

بات آپ کے علم میں آگئی ہے۔ «عَرَفَ بِعُضُّهُ وَأَغْرَضَ عَنْ بَعْضِهِ» کے الفاظ میں آپ کے حسن معاشرت کی اعلیٰ مثال کا ذکر ہے کہ آپ نے پوری بات جتنا اور پورے کا پورا الزام دینا پسند نہ فرمایا۔ آپ نے شکوہ و شکایت میں بھی الفادات و ملائمات کے پہلو کو پوشش نظر رکھا تاکہ ان زوجہ محترمہ کو انبتاہ ہو جائے۔ اس پر ان زوجہ محترمہ نے پٹخت کر سوال کیا کہ ”آپ کو یہ کس نے بتایا؟“ ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ گمان ہوا ہو کہ میں نے جن کو یہ بات بتائی تھی شاید انہوں نے حضور ﷺ کو بتا دی۔ اس لیے اپنے شک اور سوچ غلن کو فتح کرنے کے لیے انہوں نے حضور ﷺ سے وضاحت چاہی کہ آپ کو کس نے بتایا۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ کے جو الفاظ آئے ہیں ان میں تھوڑا سا اظہار ناراضگی کا پہلو بھی ہے کیونکہ یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ مجھے کس نے بتایا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک راز کی بات تھی اسے راز ہی رہتا چاہیے تھا۔ لہذا حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”مجھے تو اس خدا نے بتایا ہے جو اطہیم بھی ہے اور الجبیر بھی“۔ اس واقعے کے اجمالی ذکر کے بعد ادب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہو رہا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی جان لیجیے کہ غالباً زندگی میں مرد کا اپنی بیوی کے حق میں زرم ہوتا، شنیق ہوتا، شوہر اور بیوی کے درمیان محبت والافت، رحمت و شفقت اور مودت کا پایا جانا مطلوب ہے۔ لیکن اس میں اگر شوہر کی طرف سے زرمی زیادہ ہو جائے اور خاندان کے ادارہ کو مخلص رکھنے کا بنیادی اصول یعنی (الرِّجَالُ قُوُّمُونَ عَلَى النِّسَاءِ) کا اہتمام والتزام پوری طرح باقی نہ رہے تو خاندانی زندگی کے بنیادی ڈھانچے کو ضعف پہنچ گا۔ پھر جب معاملہ خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کا ہو تو اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ آپ کا ہر عمل امت کے لیے نمونہ ہے۔ سورة الحجرات میں بہت زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ (وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُولَ اللَّهِ) ”خوب جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔“ اس میں ایک بڑا طیف نکلتے ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا تو ایک بھی پہلو ہے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور ہم امتی ہیں، آپ ہمارے آقا ہیں، ہم آپ کے غلام ہیں اور تو کوئی رشتہ اور نسبت نہیں ہے! لیکن صحابہ کرام

اور صحابیات ﷺ کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ صحابہؓ میں سے کوئی آنحضرت ﷺ کا جچا بھی ہے اب جچا ہونے کے اعتبار سے وہ بڑا ہے، حضور ﷺ بیچجے ہیں، بیچجے کا رشتہ بہر حال چھوٹا ہے۔ اب اگر کہیں حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اپنی اس حشیثت کہمانے رکھتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیتے جو بڑا اپنے چھوٹے کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو حضور ﷺ کی حشیثت، رسالت بخود ہو سکتی تھی۔ لہذا آگاہ کر دیا گیا، متنبہ کر دیا گیا: «وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُولَ اللَّهِ» اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے مابین صرف محمد نہیں ہیں؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات، گرامی ہے الہا آپ کی اس حشیثت کو بیش پیش نظر رکھو۔

اسی بات کا اطلاق ازواج مطہرات ﷺ پر بھی ہو گا کہ یہ یوں ہونے کی حشیثت سے ان کی طرف سے ناز کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ لہذا ان کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ تمیک ہے اسے عائد ہے کہ محمد ﷺ اپنے تمہارے شوہر ہیں، اسے خصہ؟ تمیک ہے کہ محمد ﷺ اپنے تمہارے شوہر ہیں، لیکن ہر دم یہ بات پیش نظر ہے کہ یہ اللہ کے رسول بھی ہیں اور یہ بہت نازک مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احترام اور ادب کو کسی درجہ میں بھی ضعف و کمی کا امکان ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہمیشہ سخت ترین تنبیہ نظر آئے گی۔ جیسے سورۃ الجراثیم میں ہے کہ: «إِنَّ تَعْبُطَ أَعْمَالَكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ» (۲۷) ”میادا تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تم کو خبر نہ ہو۔“ اگر معاطلے کی یہ خاص صورت پیش نظر ہو تو پھر ازواج مطہرات ﷺ سے کچھ سوئے غلن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حقائق جو میں نے بیان کیے ہیں، اگر مذکورہ نظر ہیں تو پھر کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہو گی۔

زیر بحث معاملہ دوازدھی مطہرات ﷺ کے درمیان جیش آیا۔ ایک نے نبی ﷺ کا بتایا ہوار از دوسرا پر ظاہر کر دیا۔ اب دونوں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ: «إِنَّ تَوْبَةَ اللَّهِ قَدْ صَفَّ قَلُوبَ مُكْمَاءَ» ”اگر تم دونوں اللہ کی جانب میں توبہ کرو (اپنے ہمارے دل تو کرو اور اللہ سے استغفار کرو) تو (یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہوئی چکے ہیں۔“ یعنی دونوں میں تو یہ کیفیت ہے ہی، پیشہ ای اور ندامت کے جذبات

تو ہیں ہی۔۔۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مان ہوتا ہے۔ وہی بات ہے میں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناز کی وجہ سے نہ امت اور پیشیانی کے الفاظ زبان پر نہیں آ رہے، طبیعت پچھاری ہے۔ تو گویا تر غیب کا یہ نہایت بلغہ انداز ہے کہ فرمایا گیا: ”تمہارے دل تو مال ہوئی گئے ہیں۔“ جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ذرا ہمت کرو، صل میدان تو تم سر کر ہی پچے ہو، کٹھن منزل تو تم نے طے کر لی ہے، اب تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے، ہمت نہ ہارو، حوصلہ سے کام لے کر اس مرحلے سے بھی گزر جاؤ۔

اس مقام پر بعض مفسرین کو سخت مخالفتہ ہوا ہے۔ انہوں نے ”صفت“ کا مفہوم کسی شے سے اخراج سمجھا ہے، حالانکہ یہ لفظ کسی شے کی طرف جھکنے اور مال ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقدوس دہلویؒ نے بھی یہاں ”صفت“ کا ترجمہ ”جھک جانا“ کیا ہے۔ آیت کا اسلوب بھی یہی تارہ ہے کہ ”اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو مال ہوئی پچے ہیں (جھک ہی پچے ہیں)۔“ ذرا اسی یہ پچھا بہت جوش و ہر اور یہوی کے نفیاتی تعلق کی وجہ سے حائل ہے، اس جھک کو دور کرو اور اپنی خطا کا اعتراض کرو۔ اللہ سے بھی اس کے لیے استغفار کرو اور نبی ﷺ سے بھی مhydrat کرو کہ ہم سے خطا ہوئی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی جان لئی چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اگر بظاہر درستی کا پہلو ہو، بختی کا اسلوب ہو تو دیکھنا یہ ہو گا کہ خطاب کن سے ہے! بسا اوقات شفقت اور محبت ہی کے اظہار کے لیے بظاہر بختی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک شفیق والد اپنے بچے کی تربیت کے لیے بعض اوقات بختی اور درستی کا انداز اختیار کرتا ہے، لیکن کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ باپ کا دل اپنے بچے کی محبت سے خالی ہے؟ البتہ یہاں ایک بات یہ جان لیجیے کہ ”جن کے رہتے ہیں سوا ان کی سوامشکل ہے“ کے صدقائق جن کے مقامات بلند ہوتے ہیں ان کی چھوٹی سی بات پر بھی جب گرفت ہوتی ہے تو بظاہر انداز بداخت ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ”خَسَّاتُ الْأَبْرَادِ مِنَّاتُ الْمُقْرَئِينَ“ یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے

مقریبین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تفصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے  
قابل گرفت شمار ہو جائے۔ لہذا یہ معاملہ مراتب اور درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔  
یہی اسلوب ہم قرآن مجید کے بعض مقامات پر دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ  
خطاب میں بھی بظاہر کچھ ختنی کا انہصار ہو رہا ہے۔ جیسے:

﴿عَنِّيْسَ وَتَوْلَىٰ ۝ أَنْ جَاهَةُ الْأَغْنَىٰ ۝ وَمَا يُنْزِلُكَ لَعْلَةٌ يَزْعَجُكِ ۝ أَوْ ۝  
يَدْكُرُ كَفْفَعَةُ الدِّكْرُ بِي ۝ أَمَّا مِنْ اسْتَغْنَىٰ ۝ فَإِنَّ لَهُ تَعْذِيْنَ ۝﴾

”ترش رو ہوا اور بے زخی بر تی۔ اس بات پر کہہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔  
تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدر ہر جائے! یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس  
کے لیے نافع ہو! جو شخص بے پرواںی بر تا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔“

بظاہر اس اسلوب میں کچھ ختنی ہے، لیکن درحقیقت اس انداز میں محبت، شفقت اور  
عنایت پہنچا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے گرفت کا انداز نظر آتا  
ہے، جبکہ بڑی معمولی بات ہے اور عام لوگوں کے لیے غلطی بھی نہیں ہے، لیکن رسول اور  
نبی ہونے کے اعتبار سے اس پر بھی روک نوک ہو رہی ہے اور بظاہر انداز سخت نظر آ رہا  
ہے۔ اسی اصول کا ہم یہاں بھی اطلاق کریں گے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم سے  
فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنا مقام اور مرتبہ پچھاؤ تم اتهامات المؤمنین ہو، پوری امت کی خواتین  
کے لیے قیامت تک تمہارا طرز عمل نہونے کا طرز عمل ہو گا۔ لہذا تمہارا طرز عمل بڑا عالی،  
معیاری اور آئینہ میں ہونا چاہیے۔ اس میں ذرا سی کسی کسی پہلو سے بھی ہو تو ممکن ہے کہ وہ  
پہلو امت کی خواتین کے لیے بڑی بڑی تعزیتوں کا سبب بن جائے۔ اس لیے یہاں  
الفاظ میں بظاہر کچھ ختنی ہے، لیکن اس سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم کے بارے میں  
کوئی معمولی سا سوئے غلن بھی دل میں ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

آیت مبارکہ کی طرف پھر رجوع کیجئے، فرمایا: (إِنْ تَوْبَهَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَفَّتْ  
فَلَوْبَحْكَمًا،) ”اگر تم اللہ کی جانب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہو گی  
چکے ہیں۔“ (وَإِنْ تَظَهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَهُ وَجِيرُهُنْ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ،)

”اور اگر تم ہمارے نبی کے خلاف ایکا کرو گی تو جان رکھو کہ اللہ خود اپنے رسول کا رفتق ہے۔ پشت پناہ ہے اور ساتھ ہی جبریل ہیں (جو ملائکہ کے سردار ہیں) اور تمام مؤمنین صالحین (یعنی آپ کے اصحاب آپ کے پشت پناہ ہیں)۔“ (وَالْمُلِكُ لِهُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ ⑥) اور اس کے بعد تمام ملائکہ بھی ہمارے نبی کے ساتھی اور مددگار ہیں“۔۔۔ یہاں اہل ایمان کا ذکر تو صلحیت کی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن ملائکہ کے لیے فرمایا کہ کل کے کل ملائکہ کیونکہ وہ تو سب کے سب ہی صالح ہیں، ان کے بارے میں تو کوئی دوسری رائے ہوئی نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ: (يَقُلُّونَ مَا يُؤْمِنُونَ ⑦) ”وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“

آگے پھر وہی تہذید کا انداز جمل رہا ہے جس میں ازواج مطہرات ﷺ کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو ایماندار ہو فرمانبردار ہو تو بہ کرنے والیاں ہو زہد و قاعوت اختیار کرنے والیاں ہو ان پر تمہیں نازاں نہیں ہوتا چاہیے۔ تم یہ سمجھو کہ اللہ تم جیسی یا تم سے بہتر خواتین اپنے نبی کے لیے ازواج کے طور پر فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں تمہیں بالفرض اپنے اسلام و ایمان پر اپنے تقویٰ و احسان پر اور اپنی نیکیوں اور عبادت گزاریوں پر زعم ہو گیا ہے (اگر اس کا کچھ بھی امکان ہے) تو جان لو کہ اگر نبی ﷺ تم سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیں تو اللہ ان کو تم جیسی بلکہ تم سے بھی بہتر یوں یا عطا کر سکتا ہے۔ یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا کہ (عَسَى رَبُّهُ إِنْ طَلَقْتُكُنْ أَنْ يُنْدِلَهُ أَرْوَاجًا خَيْرًا مِنْكُنْ مُسْلِمَتِ مُؤْمِنَتِ فِتْيَتِ ثَيْتِ عَبْدَاتِ مِنْحَتِ تَيْتِ وَأَبْكَارًا ⑧) ”تیت“ ان خواتین کو کہا جاتا ہے جن کی ایک دفعہ شادی ہو چکی ہو، یعنی یوہ یا مطلقہ ہوں اور ”ابکار“ سے کنوواری خواتین مراد ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے حوالہ عقد میں اکثر خواتین شوہر آشنا تھیں لہذا ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا، کیونکہ ایک خاتون جسے متال زندگی کا تحریر پہلے ہو چکا ہو بعض پہلوؤں سے اس کی رفاقت شوہر کے لیے آسانی کا موجب بن جاتی ہے۔ رہا ابکار یعنی کنوواریوں کا معاملہ تو ہر شخص کے لیے کسی خاتون کا بیوی کی حیثیت سے یہ نہایت

پسندیدہ وصف ہے ہی۔

ان تین آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالہ سے ازویج مطہرات نئگفتے سے خطاب کیا گیا ہے، جس سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں اگرچہ باہمی محبت والافت، شفقت و مودت، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا لحاظ، حسن معاشرت اور زرمی کا سلوک مطلوب ہے، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں یہ یوں میں شوخی کا اندازہ جد اعتدال سے تجاوز کر جائے اور «الْكِجَالُ هُوَ مُونَ عَلَى النِّسَاءِ» کا اصول بخروف ہو جائے جو ہماری خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر خاندان کا ادارہ کمزور ہو جائے تو اس کے اثرات سارے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں، اس لیے اس اصول کو ایک واقعے کے حوالے سے ذہن نشین کروایا گیا ہے۔

عاملی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے اور "گھر" کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کے لیے ان آیات میں مسلمان عورتوں کو ایک اہم سبق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شہر کے رازوں کی امانت دار اور محافظ بنیں۔ قرآن میں ان کی صفت "لَهْفَةٌ لِّلْغَيْبِ" یعنی "رازوں کی حفاظت کرنے والا" یا "بتابی گئی" ہے۔ یہوی فطری طور پر بھی گھر کے رازوں کی امین ہوتی ہے، لیکن اگر وہ خود ہی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تو عاملی زندگی جن الجھنوں کا شکار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اس کا اندازہ کرتا کچھ مشکل نہیں۔

## تر بیتِ اولاً اور والدین کی ذمہ داریاں

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوْزًا الْفُسَكُمْ وَأَهْلِيَّكُمْ نَارًا وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْجِنَّا تَرْبَاهُ عَلَيْهَا مَلِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمْرَهُمْ وَيَقْعُلُونَ مَا يُؤْمِرُونَ ④) (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ لَا يَنْمَأْ تُعْزِزُونَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ④)

"۱۔ لوگوں جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایک حصہ انسان اور پتھر ہوں گے جس پر نہایت تند خواہ سخت کیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا

جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معدتر تین چیز نہ کر، تمہیں تو دیساہی بدله دیا جا رہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے۔

سورۃ الحیرم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری ثابت انداز میں امر کے سیخے میں بیان کی جا رہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ مضمون دو موقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ التحابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا: «يَنِيَّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَذْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادَكُمْ عَدُوًا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ»، ”اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار ہو،“۔ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقش ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کا فرمایہ ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے، لیکن بسا اوقات یہ طبی و فطری محبت حد اعتماد سے تجاوز کر کے اس درجہ پر ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائیں پوری کرنے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے انسان حرام میں مدد مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لیے محبت نہیں بلکہ عدالت میں جاتی ہے اور اس کی عاقیت کی تباہی و بر بادی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری روکع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک ثابت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندہ مومن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی روشن اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هُبْ لَنَا مِنْ أَذْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتَنَا فُرَةٌ أَعْيُنٌ وَأَجْعَنَتَا لِلْمُعْنَقِينَ إِلَّا مَا مَا﴾ (الفرقان)

”جو دعا میں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی خندک دے اور ہم کو پر ہیز گاروں کا امام بنا۔“

یہی مضمون سورۃ الحیرم کی زیر نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی ایک

مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نام نفقة کا اہتمام کرے اُنہیں کھلانے پڑائے ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جملی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مومن و مسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی تخلوق میں سے جن کو بطور امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے۔ اس امانت کا حق اس طرح ادا ہو گا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہ کا آغاز **(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَعْنُوا قُوَّاً أَنفُسَكُمْ)** ”اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو“ کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔ اس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے، کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورہ عبس میں آتا ہے: **(فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَةُ ۖ يَوْمَ يَرَوُونَ الْمَرْءَ مِنْ أَخِيهِ ۗ وَأُمِّهِ ۗ وَأَبِيهِ ۗ وَصَاحِبِهِ وَبَنِيهِ ۗ)** ”آخ کار جب وہ کان بھرے کر دینے والی آواز ہوگی۔ اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔“ اور سورہ المارج میں فرمایا گیا کہ:

**(وَلَا يَسْتَلِ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۚ يُصَرُّوْهُمْ ۖ يَوْمَ الْمُجْرُومُ لَوْ يَقْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِنِئِ ۖ بَنِيهِ ۗ وَصَاحِبِهِ وَأَخِيهِ ۗ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْبِدُهُ ۗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِحُهُ ۚ)**

”اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کونہ پوچھئے گا، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے نجتے کے لیے اپنی اولاد کو اپنی بیوی کو اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلادے۔“

اسی لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ”بچاؤ اپنے آپ کو“ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ نم سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے، کو اس آگ سے بچانے کی پدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پھر ہوں گے۔

اس سورہ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو بربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجیے۔ ہر سورہ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت مسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ آپ پیچ کی صبح کی مشینی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے، اس لیے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں ہمارہ ہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتار ہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جاشفقت و محبت کے نتیجے میں وہ پکے بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچنے کر آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بودیے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے زخم پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گا جزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے حدود اللہ نوٹ رہی ہیں، اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے او جھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہے ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں بلکہ یہ دونوں کے لیے عدالت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدة کلییہ ارشاد فرمایا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعْيَتِهِ))<sup>(۱)</sup> ”تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چراہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے روٹ کے بارے میں جواب دہ ہے۔“ جس طرح ایک چراہا اور گلمہ باں ان مو شیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المرأة راعية فی بیت زوجها و متعدد مکملات۔  
وصحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلۃ الامام العادل۔

مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس چر وابہ کا محاصلہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی لگشیدگی میں اس کی غفلت کا کتنا خل ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اس کے ماتحت ہیں وہ گویا ایک گہرے ہے جس کا وہ تکمیل ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتھوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکر مندر رہتا ہے کہ یہ چیزیں صحیح رخ پر ہیں، کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے۔ اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صدقہ دراست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گمراہے کے قریب ترین افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور خصوصاً خواتین کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی نخت جگر تو نظر حضرت فاطمہؓ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

”اے فاطمہ! اللہ کے رسول کی بپوہی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔“

حضرت صفیہؓ سے فرمایا:

”اے صفیہ! اللہ کے رسول کی بپوہی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔“

تو یہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا متوجہ کرنے، خبردار کرنے اور ترغیب و تہذیب کا انداز۔ ہر مسلمان گمراہے کے سربراہ کا یہ وہ مشتبہ روں ہے جسے اپنے اہل و عیال کے ہمراں میں ادا کرنے کے لیے اسے فکر مندر رہنا چاہیے۔

اب دیکھئے کہ یہ بول الطیف اور بلیغ ان: از اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر رکرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھروں کے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔

انسان جب جہنم میں جھوٹکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے انور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تودہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلے گی۔ پتھر کے کونلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصویر کیجھے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچنے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں، اس کی شدیدی و تیزی اور شدت کا کیا عالم ہو گا!۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبدوں سمجھا جاتا ہے، ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، ان کے آگے ما تھا بیکا جاتا ہے، ان سے حاجت روائی کے لیے دعا نئیں کی جاتی ہیں، اس لیے شرکوں کے ساتھ پتھروں کے بیٹھ بھی جہنم میں جھوک دیئے جائیں گے تاکہ ان کی حرست میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبدوں کیجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا: "اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور شد خو ہیں"۔ غور کیجھے! بہت ہی لطیف انذار ہے کہ آج تم بڑی محبت، شفقت اور لاد پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو، لیکن نتیجہ کے طور پر وہ اُن شد خو اور سخت گیر فرشتوں کے حوالے ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چیزی اولاد کتنی ہی فریاد کرے اُن فرشتوں کے دل پیچھیں کئے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور شد خو ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ "وَهَ اللَّهُ كَيْمَ طَرْفَ سَعْيَ وَالَّيْ كَيْ حَمْ كَيْ نَافِعَ كَيْ نَهِيْ" اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے۔

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے ہمارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دینہاؤں کے قصورات درحقیقت "فرشتوں پر ایمان" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس

تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو با اختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ با اختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارک سے واضح کیا گیا کہ: ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمْرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُوْمِرُونَ﴾ جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب ان کو پکارنا بے کار ان سے دعا کرنا لا حاصل اور ان کو پوچھنا بے فائدہ۔ لہذا اللہ کو پکارو اللہ سے دعا کرو اللہ سے مدد امکو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کر دے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے، کسی فرشتو کو مامور کر دے یہ اس کا اختیار مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناجائز مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ کرنی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت سورہ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے میں السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریل ﷺ سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقف وقفہ سے آتے ہیں، ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریل سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ ﴿وَمَا تَنْزَلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِنَا وَمَا خَلْقَنَا وَمَا بَيْنَ ذَلِكَهُ وَمَا كَانَ رِبُّكَ نَسِيَّاً﴾ اور (اے نبی!) ہم آپ کے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے، اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ یعنی نزولی وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمت بالغدگی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈپیار سے بگڑے تھارے یہ لاڈ لے اور پیارے جنم میں جھونکے جائیں گے تو اس وقت وہ مذدرتیں کریں گے وہاں دیں گے اور جنحے دپکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا: ﴿إِنَّمَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا إِلَيْهِمْ﴾ "اے ناشرکو! آج بہانے مت بناو (مذدرتیں نہ تراشو)۔" اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿إِنَّمَا تُجَزِّوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ "تمہیں بدلتے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے تھے۔" یہ تھارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ

ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں "sugar coated pills" کی حیثیت رکھتی تھیں؛ جس کے باعث ان کی تنگی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افhal پر اپنی خواہشات نفس کی coating کر رکھی تھی، اب وہ اتر گئی ہے، لہذا اس کی حقیقی واقعی تنگی کا مزرا ہے جو تم یہاں پکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمين!

## توبۃ نصوحاً کا ہمارے دین میں مقام

(يَأَيُّهَا الَّذِينَ أَمْنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحاً مَعْسُلِي رَبِّكُمْ أَنْ يُنْكِتُ  
عَنْكُمْ سَيِّلَتِكُمْ وَيَنْدِلُكُمْ جَنَاحَتِ تَجْرِي مِنْ تَحْيِهَا الْأَنْهَرُ ۖ يَوْمَ لَا  
يُغَزِّي اللَّهُ النَّبِيُّ وَالَّذِينَ أَمْنُوا مَعْنَى نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْمَانِهِمْ  
وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَنِّيْمُ لَنَا نُورُنَا وَأَغْفِرْنَا ۖ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ  
قَدِيرٌ ۗ يَأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدُ الْكُفَّارَ وَالْمُتَقْفِنَ وَأَغْلَظُ عَلَيْهِمْ  
وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۚ)

"اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جانب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرمادے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے داسن میں نمایاں بہتی ہوں گی۔ اس دن اللہ ہرگز زسواں کرے گا۔ اس اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہو گا ان کے سامنے بھی اور ان کے داشتی جانب بھی۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارے اس نور کو پورا فرمادے اور ہماری خطاؤں سے درگزور فرمائیقنا تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر تختی کیجئے، اور ان کا شکما ناجھم ہے اور وہ بہت سی برائیوں کا ہے۔"

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام الامان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں، لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو جو خلوص دل سے کی گئی ہو جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلہ دروس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل تفکو ہو چکی ہے اور توبہ کا فلسفہ توبہ کی عظمت ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لیے شرائط پیشے تام امور زیر بحث آپکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رض سے مردی ہے۔ اس کی ایک تحقیق علیہ روایت ہے، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمانے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے، ایک تفسیریہ پیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی اتفاق و دق سحر ایسی تھا سفر کر رہا ہے، اس کے پاس ایک اوثنی ہے، اسی پر اس کا زاد راہ یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیرستانے کے لیے کسی درخت کے سامنے بیٹھتا ہے، اونٹی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کی اونٹی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ لختی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹی کی تلاش میں کبھی ادھر دوڑتا ہے، کبھی ادھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیتالی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ اونٹی ہی درحقیقت اس کے لیے وسیلہ حیات اور زریعہ کرندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے، اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچاک وہ آنکھیں کھوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹی اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بولکھلا المحتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ ”اے اللہ! تو میرارت ہے میں تمرا بندہ ہوں“، لیکن فرط جذبات سے اس کی زبان لا کھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں ”اے پروردگار! میں تمرا برت

ہوں تو میرا بندہ ہے۔ تصور کیجئے کہ اونٹی دوبارہ پالینے پر اس شخص کی فرط سرت کا کیا  
عالم ہے! نبی اکرم ﷺ نے شمیہہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ: "اللہ کو اس سے بھی  
زیادہ خوشی اپنے کسی کنھا بندے کی توبہ سے ہوتی ہے۔" احادیث میں توبہ کی جو عظمت  
بیان ہوتی ہے اور جس قدر شدوفمد کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے  
اور پھر اس آسمت کا مطالعہ کیجئے کہ تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق  
رکھتے ہوں، خطاب فرمایا جا رہا ہے: ((يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً  
نَصْوَحَةً)) "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جتاب میں خالص توبہ۔"

توبہ کے حسن میں دو مزید احادیث بھی پیش نظر ہنی چاہئیں، جن میں نبی اکرم ﷺ  
ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر اور سو سارے اللہ کی جتاب میں توبہ اور استغفار  
کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس  
کے الفاظ ہیں: ((وَاللَّهُ أَنْتَ لَا تَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ  
مَرْأَةً))<sup>(۱)</sup> "اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جتاب میں استغفار بھی کرتا  
ہوں، توبہ بھی کرتا ہوں۔" دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ  
فرماتے ہیں: ((يَا أَيُّهَا النَّاسُ، تُوبُوا إِلَى اللَّهِ، فَإِنَّمَا تُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مَا فِي  
مَرْءَةٍ))<sup>(۲)</sup> "اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی جتاب میں توبہ کرو! اس لیے کہ میں خداوس کے حضور  
روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں۔" سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ کے کیا معنی  
ہیں؟ حضور ﷺ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ  
انیاء ﷺ مخصوص ہوتے ہیں۔ لہذا جھی طرح جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ اور آپ  
کے استغفار کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ اور اصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا، پلتنا، لوٹنا۔ اس  
کے کم از کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ

(۱) صحيح البخاري، كتاب الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة.

(۲) صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب استحباب الاستغفار  
والاستكثار منه۔

ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں: ﴿أَلَا مَنْ قَاتَ وَآتَقَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو محییت سے توبہ کرتا ہے، گناہ کو چھوڑ رہا ہے، گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسرا توبہ ہو گی اب راریعنی نیکوکاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ معرفت الہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دری کے لیے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے، اس سے کسی محییت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دری کے لیے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استھنار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے دل میں اللہ کی یاد کو مختصر کرنے کے لیے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے یہ بھی توبہ ہے۔ پھر ایک توبہ مقررین بارگاہ الہی کی ہے۔ یعنی ان کے قلب کا جو مصبوط تعلق اور رابط اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے، اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کسی محوس ہوتی ہے تو اس حسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقررین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ جب ان نفوس قدسیہ کو یہ محوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کسی ہو گئی ہے تو وہ اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تاثاری میں آپ سمجھتے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس تغییب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ أَتَهُوا تُوبَةً إِلَى اللَّهِ تُوَبَّةً نَصُوحًا﴾ اے ایمان واللہ! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ آ، خالص توبہ کون ہی ہو گی؟ اس کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہو گی۔ اگر حقوق اللہ کے حرم میں کوتای ہوئی ہے تو (۱) شدید پشیمانی ہو (۲) مضم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا، اور (۳) انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر

حقوق العباد کا معاملہ ہے تو یہ ایک شرط یہ ہو گی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے؟ اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: «عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُعَذِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتُكُمْ» عربی زبان میں ”عَسَىٰ“ اور ”عَلَىٰ“ کے الفاظ عام طور پر تو ”شاید“ کے معنی میں آتے ہیں، لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ الشتعالی کی طرف مشوہ ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہزاد اندراز کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ”تاکہ“ اور ”آمید ہے کہ“ یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہذا ترجمہ یہ ہو گا کہ ”آمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو ذور فرمادے گا“ (وَيُذْخِلُكُمْ جَنَّتَ تَعْجُرِي مِنْ تَحْسِهَا الْأَنْهَرُ) ”اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔“

آگے فرمایا کہ اس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لیے رسولی ہو گی صرف انہیاء کرام علیہم السلام ان کے بیرون کار اور سب سے بڑھ کر الہی العالم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسولی سے بچے ہوئے ہوں کے: «لَيَوْمَ لَا يُغْرِي اللَّهُ النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ» آگے فرمایا: «فُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ» ”ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہو گا“۔ یہ بات جان لیجیے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیت نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں۔ اس قلب میں جو نور ایمان ہے وہ میدان حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی۔ اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نور ایت ہے۔ البتہ اس دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوتا، میدان حشر میں اس کا ظہور ہو گا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہمتا ہاتھ ہوتا ہے لہذا آمید ان حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے دوہنی جانب نمایاں ہو گا۔ «فُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ» ”دوڑتا ہو گا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی

طرف۔۔۔ (لَيَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا فُورَّنَا وَأَخْفُرْنَا) ”اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! (اگر ہمارے نور میں کچھ کی رہ گئی ہے تو) ہمارے لیے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے۔۔۔“

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدان حشر میں یہ نور ہر شخص کو اس کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہاشمی کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رقم بھی میرا ہو تو وہ بھی ہمارے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نور ایمان اور کہاں ہمارا ایمان۔۔۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس روز میدان حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنحاء (بیکن کے دار الحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے، کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلے سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزل مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس نارجی کی روشنی کی ہی ہوگی جس کو لے کر انسان کسی پکنڈ ٹڑی پر جمل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلے کے لیے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے نور میں ہماری کوتا ہیوں کے باعث کی رہ گئی ہے، پس تو ہمارے اس نور کا انتمام فرمادے اور ہماری کوتا ہیوں سے در گز فرمائیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کی رہ گئی ہے، تو اپنے خاص خزانہ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کی اور تقدیر کی خلافی فرمادے اس لیے کہ (إِنَّكَ عَلَىٰ سُكُلٍ شَنِيٍّ وَ قَدِيرٌ) ”یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے۔۔۔“

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضمین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں

آنے خصوصاً مکالمات کے گمراہوں سے متعلق، اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عالمی نظام سے متعلق تھیں، لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ: ((يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدُ الْكُفَّارَ وَالْمُنْتَقِبِينَ وَأَغْلُظُ عَلَيْهِمْ وَ)) "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کفار اور منافقین سے جہاد کریجئے اور ان پر رنجی کریجئے"۔ وہ آپ گئی زندگی آپ کی مردگات، آپ کی شفقت اور آپ کی رحمتیں عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلطت اور رنجی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا حکما ناجنم ہے اور وہ بہت علی برالحکما ہے۔

یہ آیت لیجتہ انبیٰ الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ (آیت ۷۳) میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ الحیرم کے مضمون سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۃ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ زندگی، شفقت، دلجوئی، کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنایی فی نفسہ تو بہت اچھی باتیں ہیں، بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں، لیکن اگر ان میں حدیٰ اعدالت سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جالا ذمیار اور بے جازی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی زندگی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں زندگی کرتا ہے تو خرابی کا اندر یہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین دین فطرت ہے لہذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی میں کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((وَإِنَّمَا لِنَفْسِكَ [عَلَيْكَ] حَقُّكَ))<sup>(۱)</sup> اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ اس پر بے جانشی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہنمائیت جائز نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ))<sup>(۲)</sup> ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے بلکہ ضبط نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے تقاضوں کو صحت مند اور جائز و حلال ذرائع سے پورا کرنے کی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحجۃ، باب ما یکرہ من ترك قیام اللیل لمن كان یقومه۔ و سنت الرمذانی، کتاب الرهد عن رسول اللہ ﷺ، باب منه۔

(۲) فتح الباری لابن حجر، ۱۳/۹۔

اجازت ہے۔ اس نس کے جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اختبار سے ضروری ہیں، لہذا اس پر بھی نزی کرو۔ لیکن اگر یہ زمی حدِ اعتماد سے تجاوز کر جائے گی تو محضیت کی طرف لے جائے گی؛ لہذا اس کی باگیں تھام کرو اور سمجھ کر رکھو۔ اسی طرح کا معاملہ کفار اور منافقین کا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نزی تھمارے دل میں نہ ہو۔ الہ ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آتی ہے وہ («آیَةُ إِيمَانٍ عَلَى الْكُفَّارِ وَرَحْمَةً بِينَهُمْ») کی شان ہے۔ یعنی وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہایت رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔ کفار کے لیے ختنی کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جدی طی میں انکی نہ دھنائیں؛ وہ مسلمانوں کو زرم چارانہ سمجھ بھیشیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دیکھئے کہ آپ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ آپ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپ رُوف و رحیم ہیں آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ میں نزی رقت قلب اور خلق خدا کے حق میں رافت و رحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہذا اب اس اوقات اس سے کفار و مشرکین اور منافقین ناجائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ آپ سے فرمایا گیا:

(يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدُ الْكُفَّارَ وَالْمُنْفَقِينَ وَأَغْلُظُ عَلَيْهِمْ وَمَا وَأْنَهُمْ بِجَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ⑥)

معلوم ہوا کہ اس سورہ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے، اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق و سبق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

## عورت کا روحانی و اخلاقی تشخص

(ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتُ نُوحٍ وَامْرَأَتُ لُوطٍ كَاتَنَا  
تَحْتَ عَنْدَنِينَ مِنْ عِبَادَنَا صَالِحِينَ فَعَاهَتْهُمَا قَلْمَ بُعْنَيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ  
شَيْنَا وَرَقْلَ ادْخَلَ النَّارَ مَعَ الدُّخَلِينَ ⑦ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ اتَّهَا  
امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ إِذْ قَاتَ رَبِّ ابْنِ لَيْلَيْتَهُ بَيْنَ فِي الْجَنَّةِ وَتَجَنَّبَتِ مِنْ

بِرُّ عَوْنَ وَعَمِيلِهِ وَنَجَيْنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ⑤ وَتَرْبِيمَ اهْتَ عُمُرانَ الْئَشْيَ  
أَخْصَنَتْ لَرْجَهَا قَفْعَهَا فِي مِنْ دُوْرِهَا وَصَلَّتْ بِكَلِمَتِ رِهَهَا وَكُجُيْهَ  
وَحَكَائِتْ مِنَ الْشَّيْنِيْنَ ⑥ )

”اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لیے فوج اور لوط (چیز) کی  
بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں حصہ تو انہوں  
نے ان سے خیانت کی روشن اختیار کی تو وہ دونوں ان (انہی بیویوں) کو اللہ کے  
عذاب سے نہ بچا سکئے اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو  
جاو آگ میں دوسرا دفعہ داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال  
بیان فرمائی ہے اہل ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا اے  
مرے رب! مرے لیے اپنے پاس ایک گھر جنت میں ہا اور مجھے فرعون اور  
اس کے علی سے نجات دے اور مجھے نجات بخش خالموں کی قوم سے۔ اور عمران  
کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی ہے جس نے اپنی صستی کی پوری حفاظت کی  
تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھوٹا اور اس نے تصدیق کی اپنے رب کی  
 تمام باتوں کی اور اس کی کتابیوں کی اور وہ ہمارے بہت سی فرمانبردار  
بندوں میں سے تھی۔“

یہ بات عرض کی جا سکی ہے کہ سورۃ الحیرم میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی  
منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رفتہ ازدواج کر جس سے خاندان کے ادارہ کی  
بیاناد پڑتی ہے کے ضمن میں نہایت اہم اور بیانادی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔  
عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے؟ آپ  
کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں اس دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو  
بالکل بیجز کمری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا ہمارے ہاں بول چال کے عام  
حاورے میں اسے جوتی کی لوگ سے تعبیر کیا گیا یا ہمارے بازار میں لاٹھا یا گیا اور  
کبھی اسے گوب پھرہ کا روپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھینے کے لیے آزاد چوڑ دیا  
گیا۔ یا افراط و تفریط ہے جس میں فوج انسانی بالعموم جلا رہی ہے۔ اسلام نے عورت کو

ایک مکمل قانونی اور اخلاقی شخص عطا کیا، پھر اس کے دائرہ عمل اور میدان کا رکھ تھا کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ چنانچہ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی شخص دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی شخص بھی عطا کیا ہے۔ عورت اگر کوئی یہ کام کرتی ہے تو اس کا اجر و ثواب اس کے لیے ہے۔ وہ اس محاطے میں مردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر اپنی بیوی کے ننان و نعمت کا کفیل اور فرمہ دار تو ہے، لیکن اس کے دین و اخلاق کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر عورت میں نیکی اور بھلائی ہوگی تو وہ اس کے لیے ہے، عورت کوئی خیر کائے گی تو اس کا حصلہ اور اجر و ثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح اگر مرد کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کا اجر و ثواب اسی کے لیے ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ ﴿لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ (النجم) ”کسی انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لیے اس نے تجھت کی ہے“۔ جس کے لیے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے۔

پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں فرمایا گیا: ﴿أَتُنِّي لَا أُضْبِعُ عَمَلَ خَالِقِكُمْ قَنْ ذَكَرْ أَوْ أَنْثى، بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ﴾ ”میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں“ خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو یا عورت ہو تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔ یعنی مرد و عورت کا فرق و تفاوت خواہ جسمانی ہو خواہ نفیساتی ساخت کے اعتبار سے ہو یہ فرق تو ہم نے تدبی ضروریات کے تجھت رکھا ہے باقی انسان ہونے کے اعتبار سے تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے

آتا ہے : (اللَّتِي جَاءَ نَصِيبُهُ مِمَّا اكْسَبُوا وَلِلَّاتِي نَصِيبُهُ مِمَّا اكْسَبَنَّ)۔ ”مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی۔ یعنی جو بھلا نیاں، نیکیاں، خیرات اور حسنات مردوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں، ان کا اجر و ثواب ان کے لیے ہے اور جو بھلا نیاں اور نیکیاں عورتوں نے کمائی ہیں، ان کا اجر و ثواب ان کے لیے ہے۔ اسی طرح جو براہی اور بدی تر دکانے والے اس پر ہو گا اور جو بدی اور براہی عورت کمائے گی اس کی پاداش اس کو حاصل ہوگی۔

اس اصول کو سورۃ الْحِرَمٰ کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کہیں اس مخالفت میں نہ رہیں کہ ان کے شوہر اُن کے دین و اخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین و اخلاق کے معاملہ میں مردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ مثلى مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے ملیل القدر رسول تھے ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط عليهم السلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ دین کے اعتبار سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ ہے وفاتی کی تھی۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ اُن سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بے وفاکی کا عمل ہے۔ اس لیے کہ سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں جہاں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ (اللَّتِي جَاءَ فَطَمَونَ عَلَى النِّسَاءِ) یعنی مرد عورتوں پر مگر ان اور حاکم ہیں وہاں ایک مثالی (ideal) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ (فَالصِّلْحَةُ فِي نِسْتَ  
لَحِفْظَ لِلْغَيْبِ) ”پس نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمادری کی روشن اختیار کریں (اپنے شوہروں کا کہنا نہیں اور ان کے) رازوں کی پوری حفاظت کریں“۔ ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا رازدار اور کون ہو گا! مرد میں اگر کوئی خای ہے، اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے تو اس کی بیوی سے بڑھ کر جانے والا اور کوئی نہیں۔ کویا مرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔ راز کو بھی امانت

کہا گیا ہے۔ لہذا اگر شوہرنے کوئی راز کی بات یہوی کو بتائی ہو اور یہوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے۔ چنانچہ ”فَخَانَتْهُمَا“ کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بدھلن اور بدکار تھیں (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے اصول کو اگر پیش نظر رکھیں تو یہ بات سمجھ معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبلہ عقد میں کوئی بدھلن اور بدکار محورت ہو۔ لہذا ان خواتین کا یہ طرزِ عمل کہ وہ درپر وہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں، اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں جو اصل بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبلہ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہذا ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو گا اور رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی قائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ فرمایا گیا: (وَقَبِيلَ اذْخُلَا النَّارَ مَعَ الدُّخُولِينَ ۝) ”اور ان سے کہہ دیا گیا دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔“ یہاں ”قَبِيلَ“، فعلِ ماضی مجبول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعلِ ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فعلِ ماضی میں قطعیت و حسمیت ہوتی ہے کہ کوئی کام ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی تینی بات وہ ہوتی ہے جو دفع پذیر ہو جکی ہو اتنی ہی تینی بات قیامت و آخرت کی ہے۔ لہذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا مینہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں عالمِ برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو، و اللہ اعلم بالصواب۔ لیکن یہاں جس حقیقت کی طرف نشاندہی مقصود ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے بھی ہمارے سامنے آ جکی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی لخت جگر، فور نظر حضرت قاطمہ رضی اللہ عنہما سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے قاطمہ! احمد (رضی اللہ عنہ) کی بیٹی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ! اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ حضرت نوح اور

حضرت نوٹ (جیہا) جیسے جلیل القدر تفہیر آخوت میں اپنی یو یوں کے کام نہ آئیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جود و بہترین شوہروں کے جملہ عقد میں تمیں، لیکن چونکہ وہ خود اہل ایمان میں سے نہ تمیں ہے اُن کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے بعد اس ایک مثال ایک بدترین شخص کے نام میں ایک نہایت نیک اور صالح خاتون کی آرہی ہے۔ فرعون جیسے سرکش و متسرد اللہ کے با غنی اور خدا تعالیٰ کے مدحی شخص کے عقد میں حضرت آئے ہے تمیں تمیں۔ اغلبًا یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ (صلوات اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکلا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی پروردش وہ خود کریں گی۔ وہ یقیناً نبی اسراeel کی کوئی مؤمنہ و صالح خاتون تمیں جو فرعون کی بیوی تمیں۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کامل اور وہاں کی آسائش اور سہوتیں نیز وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ شوہر کی خلافت، اس کی گمراہی و بے راہ روی اور اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام جو شاہی محل کا بجز دلایا تھک ہوتا ہے ان پر دو محترم تھا۔ چنانچہ ان کی دعا قرآن نے ہمیں الفاظ نقل کی ہے: «رَبَّ أَبْنَى لِيْلَى عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجَّيْنَا مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَّلَهُ وَنَجَّيْنَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ①» یعنی پروردگارا مجھے جلد سے جلد فرعون سے اس کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوار رحمت یعنی جنت میں میرے لیے گھر بنا۔ اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بد کردار یا کافر و مشرک ہو اگر وہ عورت خود مؤمنہ اور صالح ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب اس تمیں میں تیسرا مثال ایک الگی خاتون کی آرہی ہے کہ جنمیں ما حل بھی بہترین ملا اور بھر جن کے اپنے اندر بھی نیکی بھلائی اور حنات کے بہترین رحمات اور میلانات تمام و کمال موجود تھے۔ گویا وہ نُور علی نور کی مثال ہیں۔ چہلی مثال

بہترین شوہروں کے گھروں میں بذریں بیویوں کی تھی۔ دوسری مثال اس کے عکس ایک بذریں شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون کی تھی ۔۔۔ اور اب تیرنی مثال حضرت مریم سلام علیہا کی آرٹی ہے جو خوبی بھی نیک صالحی اور عبادت گزار تھیں پھر ان کی والدہ بھی اس قدر نیک تھیں کہ انہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا، جس کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت ۲۵ میں باس الفاظ آیا ہے: «وَإِذْ أَتَىٰ لَهُنَّاً ثَلَاثَةٌ لَكَ مَا فِي بَطْنِيٍّ مُحَرَّرًا» ”اے میرے رب! میں نے تیرے لیے نذر کیا جو پھر میرے پیٹ میں ہے دنیا کے تمام بکھریوں سے اسے چھکارا دلاتے ہوئے“۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون جیں جن کی آنکھوں میں حضرت مریم نے پروردش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا (علیہ السلام) کو ان کا مریض اور کفیل بنایا جو اللہ کے طبیل القدر نبی اور جیکل سلیمانی (بیت المقدس) کے جاودا اور گران بھی تھے اور رشتہ میں حضرت مریم کے خالو تھے۔ تو گویا یہ فوڑ علی نور کا حاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریم سلام علیہا کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی اللہ تعالیٰ مدح فرماء ہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت و عفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر و اقدیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو ناکھدا ہو، جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ حاملہ ہو جائے آپ خود سوچنے کہ معاشرہ میں کسی رسولوں کا سامان ہے جو ان کے لیے فراہم ہو گیا! اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں بٹلا کیا! لیکن اس اللہ کی بندی نے اپنے رب کے ہر حکم کے سامنے سرتسلیم خم کیا (وَأَتَلَّتْ بِمَكْلِمَتِ رَبِّهَا وَسُكْبِهِ) یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تکمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم دینیہ سے انہیں خصوصی و پختگی تھی۔ آیت کے آخر میں ان کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی گئی: (وَسَكَانُتْ مِنَ الْفَطِيْثِيْنَ ⑦) ”اور وہ اللہ کے فرمائی برداروں میں سے (ایک بندی) تھی۔۔۔“

غور کیجئے کہ یہاں تم مثالوں کے ذریعے تین مکان صورتوں کو بیان کر دیا گیا، لیکن ایک امکان بھی باقی ہے۔ گویا اس عمارت کا ایک کونہ بھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے ہاں بدرین شوہرت کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوٹ کی یہاں ہیں بہترین شوہر کے ہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسمیہ ہیں، جبکہ بہترین ماخول میں بہترین خاتون کی مثال حضرت مریم ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدرین ہو اور یہو بھی۔ گویا (ظلمت بعضها فوق بعض) کا نقشہ ہوتے ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں کہ کریما اور پھر نہم چڑھا۔ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللہب۔ اس سورۃ مبارکہ میں ابوالہب اور اس کی یہوی دونوں کا ذکر ہے:

(لَيْلَتُ يَدَدَ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَ ① مَا أَنْهَنِي عَنْهُ مَالُهُ وَمَا سَكَبَ ②  
سَيَصْلُلِي نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَأَمْرَأَةً دَحَّمَالَةَ الْحَطَبِ ④ فِي جِنِحَّهَا  
خَلْلٌ مِّنْ مَسْدِدٍ ⑤)

اس سورۃ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے مچا ابوالہب اور آپؐ کی چچی (ابوالہب کی یہوی) اُم جمیل کی آنحضرت ﷺ سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرم ﷺ سے زیادہ عداوت، بغض اور دشمنی تھی، کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضرت ﷺ کی دشمنی عداوت اور ایذ ارسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللہب میں بدرین شوہر اور بدرین یہوی کی مثال موجود ہے۔ اس طرح یہ کونہ اور گوش بھی نہ ہو جاتا ہے کہ شوہر بھی بدرین ہو اور یہو بھی بدرین ہو تو اس کی صورت کیا ہوگی۔ چنانچہ ان کے بارے میں اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ نہادیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو تجھے لکھا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک ذاتی شخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ شخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلاقی، نکلی اور خیر ہے تو وہ اسی

کے لیے ہے، لیکن برائی بدی اور سرکشی ہے تو اس کا و بال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عالیٰ نظام میں مالی اختیار سے شوہر بیوی کا کنفیل ہوتا ہے لہذا ہمارے ہاں بعض خواتین کو غیر شوری طور پر یہ مخالف لائق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا، بھلا نیاں کہانا اور دین کی خدمت کرنا، یہ صرف مردوں کے کرنے کا کام ہے اور مرد اگر یہ کام کر لیں تو خورتوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اس مخالفت کی ان آیات مبارکہ کی روشنی میں کامل اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کے لیے میں پھر وہی الفاظ دہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں آئے کہ: ﴿لِلَّهِ جَاءَ نَصِيبٌ مِّمَّا أُكْسِبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا أُكْسِبُنَّ﴾ (جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ خورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے!)“

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين



مرکزی انجمن خدمت القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرخشہ لقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

دیسخ پایانے — اور — اعلیٰ علمی طبع

پر تشویر و اشاعت ہے

تاکہ انسانیت کے فیض غاصب میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک بنا پڑ جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور مانی

کی راہ ہمارا ہو کے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ